ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY

USMAN NOTES
www.usmannotes.com

Name:

Registration No.:

Course Code: 2958

Program: BS (Islamic Studies)

Semester: Autumn 2026

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

(شعبہ شریعہ، کلیہ عربی وعلوم اسلامیہ)

کورس: مطالعہ متونِ فقہ اسلامی (الہدایہ کتاب النکاح والطلاق) (2958) • سطح: بی ایس (علوم اسلامیہ)

سمسٹر: خزاں 2026

امتحانی مشق نمبر 1 (یونٹ: 01 تا 05)

کل نمبر: 100 • کامیابی کے نمبر: 0

حل شدہ اسائنمنٹ گائیڈ

Reference &For Study — SOLVED ASSIGNMENT GUIDE

نوٹ: یہ گائیڈ صرف مطالعہ اور حوالے کے مقصد کے لیے تیار کی گئی ہے۔ طلبہ کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ کورس کی کتاب کے متعلقہ یونٹس غور سے پڑھیں، تصورات کو اچھی طرح سمجھیں اور پھر اسائنمنٹ اپنے الفاظ میں لکھیں۔ اس گائیڈ کو ہو بہو نقل کرنے کے بجائے اپنی فہم کے مطابق تحریر کریں۔ جہاں کسی دینی یا قانونی مسئلے میں قطعی رائے درکار ہو وہاں اہلِ علم اور مستند علماء کی طرف رجوع کریں۔

سوال نمبر 1: نکاح کے انعقاد میں ایجاب و قبول کے الفاظ اور صیغے (20 نمبر)

سوال نمبر 1: کتاب الہدایہ کی روشنی میں نکاح کے منعقد ہونے کے لیے ایجاب و قبول کے الفاظ اور صیغوں (ماضی، امر وغیرہ) کی کیا شرائط ہیں؟ اس سلسلے میں امام شافعیؒ اور ائمہ احنافؒ کے دلائل کا موازنہ کریں۔ (20)

تعارف

نکاح اسلامی شریعت میں محض ایک سماجی رسم نہیں بلکہ ایک باقاعدہ شرعی عقد ہے جس سے حلت، مہر، نفقہ، وراثت اور نسب جیسے بڑے احکام وابستہ ہوتے ہیں۔ ہر عقد کی طرح نکاح کی بنیاد بھی دو فریقوں کی رضامندی کے اظہار پر ہے جسے فقہ کی اصطلاح میں ایجاب و قبول کہا جاتا ہے۔ علامہ مرغینانی رحمہ اللہ نے الہدایہ کے کتاب النکاح میں نکاح کی تعریف کرتے ہوئے اسے ایک ایسا عقد قرار دیا ہے جو مخصوص الفاظ کے ذریعے منعقد ہوتا ہے، اور پھر اس کے انعقاد کی شرائط، الفاظ اور صیغوں کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس سوال میں یہی بحث مطلوب ہے کہ ایجاب و قبول کے الفاظ کیسے ہونے چاہئیں، صیغہ ماضی کی شرط کیوں ہے، صیغہ امر سے نکاح کب منعقد ہوتا ہے، اور اس مسئلے میں امام شافعی رحمہ اللہ اور ائمہ احناف رحمہم اللہ کے مابین اختلاف کی نوعیت اور دلائل کیا ہیں۔ یہ بحث بالصتاً علمی اور تعلیمی ہے؛ کسی معین واقعے پر شرعی حکم کا اطلاق اہلِ علم اور مستند علماء کا کام ہے۔

ایجاب و قبول کی تعریف اور مجلسِ عقد کی شرط

الہدایہ کے مطابق ایجاب اس پہلے کلام کو کہتے ہیں جو دو عاقدوں میں سے کسی ایک کی طرف سے پیش کیا جائے، خواہ وہ مرد کی طرف سے ہو یا عورت یا اس کے ولی کی طرف سے، اور قبول اس دوسرے کلام کو کہتے ہیں جو اسی مجلس میں دوسرے فریق کی طرف سے اس پیشکش کی منظوری میں کہا جائے۔ اس تعریف سے معلوم ہوا کہ احناف کے نزدیک ایجاب کا مرد ہی سے صادر ہونا ضروری نہیں، عورت یا اس کے ولی کی طرف سے پہلا کلام بھی ایجاب بن سکتا ہے اور مرد کا کلام قبول۔ دوسری بنیادی شرط اتحادِ مجلس ہے، یعنی ایجاب و قبول ایک ہی مجلس میں ہوں؛ اگر ایجاب کے بعد مجلس بدل جائے، فریقین کسی اور کام میں مشغول ہو جائیں یا قبول اسی مجلس میں نہ ہو تو نکاح منعقد نہیں ہوتا، کیونکہ قبول کا تعلق اسی پیشکش سے رہنا ضروری ہے جو ابھی باقی ہے۔ البتہ غائب شخص کی طرف خط یا قاصد کے ذریعے بھیجے گئے ایجاب کی صورت میں جس مجلس میں خط پڑھا جائے اور قبول کیا جائے وہی مجلسِ عقد شمار ہوتی ہے، چنانچہ تحریر اور قاصد کو بھی احناف نے قائم مقامِ خطاب مانا ہے۔ عاقدین کا عاقل ہونا بھی ضروری ہے، اور نابالغ کی طرف سے اس کا ولی عقد کرتا ہے، جس کی تفصیل ولایت کے باب میں آتی ہے۔

صیغوں کی شرائط: ماضی کی شرط اور اس کی حکمت

الہدایہ کی صریح عبارت کا مفہوم یہ ہے کہ نکاح ایجاب و قبول سے منعقد ہوتا ہے، ایسے دو لفظوں کے ساتھ جن میں سے ہر ایک ماضی پر دلالت کرے، یا ایک ماضی پر اور دوسرا مستقبل یعنی حال و استقبال کے معنی پر دلالت کرے۔ اس کی عام مثال یہ ہے کہ ایک فریق کہے کہ میں نے تم سے نکاح کیا یا میں نے اپنی بیٹی کا نکاح تم سے کر دیا، اور دوسرا کہے کہ میں نے قبول کیا۔ ماضی کی شرط کی وجہ یہ ہے کہ عقد ایک انشائی فعل ہے جس سے فوری طور پر شرعی اثر پیدا ہونا مقصود ہوتا ہے، اور عربی زبان میں ماضی کا صیغہ کسی کام کے وقوع اور تحقق پر دلالت کرتا ہے، اس لیے اس سے عقد فوراً ثابت ہو جاتا ہے اور کوئی احتمال باقی نہیں رہتا۔ اس کے برعکس اگر دونوں صیغے مستقبل یا وعدے کے ہوں، مثلاً میں نکاح کروں گا اور میں قبول کروں گی، تو یہ محض وعدہ اور ارادے کا اظہار ہے، عقد نہیں، کیونکہ مستقبل کا صیغہ وعدے کے لیے بھی آتا ہے اور وعدے سے عقد منعقد نہیں ہوتا۔ اسی اصول پر احناف نے یہ مسئلہ نکالا کہ جہاں ایک صیغہ ماضی کا ہو اور دوسرا ایسا ہو جو حال کے معنی دے، وہاں عقد منعقد ہو جاتا ہے، کیونکہ ماضی کی موجودگی میں دوسرا کلام اسی کی تکمیل بن جاتا ہے۔

صیغہ امر سے نکاح کا انعقاد

صیغہ امر کی صورت یہ ہے کہ مرد عورت یا اس کے ولی سے کہے کہ مجھ سے نکاح کر دو یا اپنی بیٹی کا نکاح مجھ سے کرو، اور دوسرا فریق اسی مجلس میں کہے کہ میں نے کر دیا یا میں نے تم سے نکاح کر دیا، تو احناف کے نزدیک نکاح منعقد ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ امر کا یہ کلام درحقیقت توکیل اور پیشکش کا مفہوم رکھتا ہے؛ گویا کہنے والے نے دوسرے کو اپنی طرف سے عقد کی اجازت اور اختیار دیا اور جب دوسرے نے ماضی کے صیغے سے عقد کر دیا تو قبول اسی میں شامل سمجھا گیا۔ الہدایہ نے اسے اس مثال سے واضح کیا ہے کہ مرد کہے زوِّجنی یعنی میرا نکاح کر دو، اور دوسرا کہے زوَّجتک یعنی میں نے تمہارا نکاح کر دیا، تو نکاح ثابت ہو جاتا ہے۔ یہی حکم اس صورت میں بھی ہے کہ حاضر شخص کے بجائے خط میں امر لکھا جائے اور مجلسِ قراءت میں ماضی کے صیغے سے جواب دیا جائے۔ البتہ اگر امر کے جواب میں بھی وعدہ یا مستقبل کا کلام ہو تو عقد نہیں ہو گا، کیونکہ انعقاد کے لیے کم از کم ایک قطعی اور محقق صیغہ ناگزیر ہے۔

Figure 1: Conclusion of nikah — ijab and qabool (Hanafi view)



شکل 1: احناف کے نزدیک نکاح کے انعقاد کی ترتیب — ایجاب، اسی مجلس میں قبول، اور کم از کم ایک صیغہ ماضی

نکاح کے مخصوص الفاظ اور کنائی الفاظ کا حکم

الفاظ کے اعتبار سے الہدایہ نے نکاح اور تزویج کے الفاظ کو اصل قرار دیا ہے، یعنی وہ الفاظ جو انہی دو لفظوں سے مشتق ہوں ان سے نکاح بلاشبہ منعقد ہوتا ہے، کیونکہ یہی الفاظ قرآن مجید میں اس عقد کے لیے استعمال ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ احناف کے نزدیک وہ الفاظ بھی نکاح کے انعقاد کا ذریعہ بن سکتے ہیں جن سے عورت کی ذات پر ملک اور تملیک کا مفہوم حاصل ہو، جیسے ہبہ، تملیک، بیع اور صدقہ کے الفاظ، بشرطیکہ مجلس اور قرینے سے نکاح ہی مراد ہو۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایک خاتون کا اپنے آپ کو ہبہ کرنا قرآن مجید میں بیان ہوا ہے (الاحزاب: 50 کے مفہوم کے مطابق) اور آپ نے ایک صحابی کا نکاح اس عورت سے ہبہ کے لفظوں میں کر دیا تھا جب اس نے اپنے آپ کو پیش کیا، جیسا کہ مشہور حدیث میں مذکور ہے۔ احناف کہتے ہیں کہ عقد کی حقیقت رضامندی اور مفہوم کی ادائیگی ہے، لفظ محض اس کا ذریعہ ہے؛ جب مفہوم ثابت ہو اور شرائط پوری ہوں تو عقد منعقد ہو گا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں امام شافعی رحمہ اللہ کا موقف احناف سے جدا ہوتا ہے، جس کی تفصیل آگے موازنے میں آتی ہے۔

امام شافعیؒ اور ائمہ احنافؒ کے موقف کا موازنہ

اس باب میں اختلاف کی چند نمایاں صورتیں ہیں۔ پہلا اختلاف الفاظ میں ہے: امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک نکاح صرف نکاح یا تزویج سے مشتق الفاظ سے منعقد ہوتا ہے، ہبہ، بیع اور تملیک جیسے کنائی الفاظ سے نہیں، کیونکہ نکاح ایک مخصوص شرعی عقد ہے جس کے الفاظ شریعت نے متعین کیے ہیں اور اس میں قیاس کا راستہ تنگ ہے؛ ان کی دلیل یہ بھی ہے کہ ہبہ کا حکم قرآن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات میں سے بیان ہوا ہے، اس لیے امت کے لیے اسے بنیاد نہیں بنایا جا سکتا۔ احناف کا جواب یہ ہے کہ خصوصیت آپ کی ذات کے اس پہلو میں تھی کہ آپ کے لیے بلا مہر نکاح جائز تھا، ورنہ الفاظ کی دلالت عام ہے اور صحابی کے واقعے میں آپ نے خود ہبہ کے مفہوم پر نکاح منعقد

فرمایا۔ دوسرا اختلاف ایجاب و قبول کے صادر کنندگان میں ہے: شوافع کے نزدیک ایجاب ولی کی طرف سے اور قبول شوہر کی طرف سے ہونا چاہیے، کیونکہ ان کے نزدیک عورت خود اپنا نکاح نہیں کر سکتی اور ولی ہی عاقد ہوتا ہے؛ احناف کے نزدیک بالغ عاقلہ عورت خود بھی عقد کر سکتی ہے اور پہلا کلام کسی طرف سے بھی ہو سکتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں عورت کی طرف نکاح کی نسبت بھی فرمائی ہے اور حدیث میں بیوہ کو اس کے ولی سے زیادہ اپنے نفس کا حقدار قرار دیا گیا ہے، جس سے بالغہ کی اہلیت ثابت ہوتی ہے۔

جدول 1: ایجاب و قبول میں احناف اور امام شافعیؒ کے موقف کا موازنہ

پہلو	ائمہ احناف	امام شافعیؒ
ایجاب کا صادر کنندہ	مرد، عورت یا ولی، کسی کی طرف سے پہلا کلام ایجاب بن سکتا ہے	ایجاب ولی کی طرف سے اور قبول شوہر کی طرف سے ہونا چاہیے
کنائی الفاظ (ہبہ، تملیک وغیرہ)	قرینے اور مفہوم کی صورت میں نکاح منعقد ہو جاتا ہے	نکاح صرف نکاح و تزویج کے الفاظ سے منعقد ہوتا ہے
صیغہ امر	امر کے جواب میں ماضی کے صیغے سے عقد منعقد ہو جاتا ہے	صریح متعین الفاظ اور ترتیب کی پابندی پر زور
بالغہ عورت کی اہلیت	بالغ عاقلہ خود اپنا نکاح کر سکتی ہے (کفو کی شرط کے ساتھ)	ولی کے بغیر نکاح منعقد نہیں ہوتا

تیسرا اہم پہلو دلائل کی بنیاد ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کے یہاں مشہور حدیث لا نکاح الا بولی یعنی ولی کے بغیر نکاح نہیں، مرکزی دلیل ہے، جس سے وہ ولایت کو نکاح کی صحت کی شرط قرار دیتے ہیں اور نتیجتاً ایجاب کا ولی سے صادر ہونا بھی لازم آتا ہے۔ احناف اس حدیث کو نابالغہ اور غیر اہل پر محمول کرتے ہیں یا اس سے کمال اور افضلیت مراد لیتے ہیں،

اور اپنے موقف پر قرآن مجید کی ان آیات سے استدلال کرتے ہیں جن میں عورت کی طرف نکاح کا فعل منسوب ہوا ہے، جیسے سورۃ البقرہ میں مطلقہ کے بارے میں یہ ارشاد کہ جب وہ اپنے شوہروں سے نکاح کر لیں تو انہیں نہ روکا جائے (البقرہ: 232 کے مفہوم کے مطابق)۔ اسی طرح احناف کہتے ہیں کہ عورت اپنے مال میں تصرف کی اہل ہے تو اپنے نفس میں تصرف کی بطریق اولیٰ اہل ہونی چاہیے، البتہ غیر کفو میں نکاح کی صورت میں ولی کو اعتراض کا حق دے کر خاندانی مصالح کی حفاظت بھی کر دی گئی ہے، جو اگلے سوالات میں بیان ہو گا۔ موازنے کا خلاصہ یہ ہے کہ اختلاف لفظی پابندی اور مفہوم کی وسعت کا ہے: شوافع الفاظ کی تعین اور احتیاط کو مقدم رکھتے ہیں جبکہ احناف عقد کے مفہوم، عرف اور ضرورت کو بھی ملحوظ رکھتے ہیں؛ دونوں فریقین کی بنیاد قرآن و سنت ہی کے دلائل ہیں اور یہ اختلاف اجتہادی نوعیت کا ہے جس میں ہر مسلک کی پیروی کرنے والا اپنے امام کے دلائل پر عمل کرتا ہے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ الہدایہ کے مطابق نکاح ایجاب و قبول سے ایک ہی مجلس میں منعقد ہوتا ہے، انعقاد کے لیے کم از کم ایک صیغہ ماضی یا حال کے قطعی مفہوم کا ہونا ضروری ہے، محض وعدے کے صیغوں سے عقد نہیں ہوتا، صیغہ امر کے جواب میں ماضی کے صیغے سے بھی نکاح ثابت ہو جاتا ہے، اور نکاح و تزویج کے صریح الفاظ کے ساتھ ساتھ مفہوم دینے والے کنائی الفاظ سے بھی احناف کے نزدیک عقد منعقد ہو سکتا ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ الفاظ کی تعین، ولی کے ایجاب اور ترتیب کے قائل ہیں جبکہ احناف مفہوم اور اہلیت میں وسعت کے قائل ہیں۔ طالب علم کے لیے اس بحث کا حاصل یہ ہے کہ وہ ہر مسلک کے دلائل کو اس کی اصل کتب سے سمجھے اور اختلافی مسائل میں ادبِ اختلاف کو ملحوظ رکھے، کیونکہ ان مباحث کا مقصد فہمِ دین ہے، کسی فریق کی تنقیص نہیں۔

سوال نمبر 2: نکاح کے گواہوں کی شرائط اور ذمی گواہوں کی اہلیت (20 نمبر)

سوال نمبر 2: "الہدایہ" کے مطابق نکاح کے صحیح ہونے کے لیے گواہوں میں کن شرائط کا ہونا ضروری ہے؟ نیز ذمی (غیر مسلم) کے نکاح میں ذمی گواہوں کی اہلیت کے بارے میں فقہاء کے اختلاف کی وضاحت کریں۔ (20)

تعارف

نکاح کے احکام میں گواہی کو بنیادی حیثیت حاصل ہے، کیونکہ نکاح ایک ایسا عقد ہے جس کے اثرات صرف دو افراد تک محدود نہیں رہتے بلکہ نسب، وراثت، مہر اور خاندانی حقوق اس سے وابستہ ہو جاتے ہیں۔ اسی لیے شریعت نے اس عقد کو خفیہ رکھنے کے بجائے گواہوں کی موجودگی میں آشکارا کرنے کا حکم دیا ہے، تاکہ کل کو انکار یا جھگڑے کی صورت میں عقد کا ثبوت ممکن ہو اور فریقین کے حقوق محفوظ رہیں۔ الہدایہ کے کتاب النکاح میں گواہوں کی تعداد، ان کی شرائط اور اہلیت کے مسائل تفصیل سے بیان ہوئے ہیں۔ اس سوال میں دو باتیں مطلوب ہیں: پہلی یہ کہ نکاح کے صحیح ہونے کے لیے گواہوں میں کون سی شرائط پائی جانی چاہئیں، اور دوسری یہ کہ اگر نکاح کرنے والے دونوں فریق ذمی یعنی غیر مسلم اہلِ کتاب یا اہلِ ذمہ ہوں تو کیا ذمی گواہوں کی گواہی اس نکاح کے لیے کافی ہو گی یا نہیں، اور اس میں فقہاء کا اختلاف کیا ہے۔ یہ بحث بھی خالص علمی ہے؛ عملی فتویٰ اہلِ علم سے حاصل کیا جاتا ہے۔

گواہوں کی تعداد اور مجلس میں حاضری کی شرط

الہدایہ کے مطابق نکاح دو گواہوں کی موجودگی کے بغیر منعقد نہیں ہوتا۔ گواہ یا تو دو مرد ہوں یا ایک مرد اور دو عورتیں، بالکل اسی ترکیب کے ساتھ جو مالی معاملات کی گواہی میں قرآن مجید نے بیان فرمائی ہے (البقرہ: 282 کے مفہوم کے مطابق)۔ گواہوں کی حاضری سے مراد یہ ہے کہ وہ عقد کی مجلس میں موجود ہوں اور دونوں فریقوں کے ایجاب و قبول کو خود سنیں اور سمجھیں، کیونکہ گواہی کا مقصد ہی یہ ہے کہ ضرورت کے وقت وہ اس واقعے کی سچی خبر دے سکیں جو انہوں نے دیکھا اور سنا۔ اگر گواہ مجلس میں موجود ہوں مگر ایجاب و قبول کی بات نہ سن سکیں، مثلاً وہ سو رہے ہوں یا زبان نہ سمجھتے ہوں، تو ان کی موجودگی معتبر نہیں۔ اسی طرح اگر ایک گواہ ایک موقع پر اور دوسرا دوسرے موقع پر حاضر ہو تو گواہی کامل نہیں ہوتی، کیونکہ ایجاب و قبول دونوں کا ایک ہی ساتھ سنا جانا شرط ہے۔ نکاح کے بالمشافہ ہونے کے ساتھ ساتھ گواہوں کی موجودگی اس عقد کو اعلان اور شہرت بھی عطا کرتی ہے، اور یہی وجہ ہے کہ فقہاء نے نکاح کو چھپانے کو ناپسندیدہ اور گواہوں کے بغیر کیے گئے عقد کو ناقص قرار دیا ہے۔

گواہوں کی ذاتی شرائط: بلوغ، عقل، آزادی اور اسلام

الہدایہ کے مطابق گواہوں میں درج ذیل شرائط کا ہونا ضروری ہے۔ پہلی شرط بلوغ ہے، یعنی گواہ بالغ ہوں؛ نابالغ بچہ گواہ نہیں بن سکتا کیونکہ وہ شہادت کی ذمہ داری کی اہلیت نہیں رکھتا۔ دوسری شرط عقل ہے؛ پاگل اور مجنون کی گواہی مقبول نہیں، کیونکہ گواہی کا مدار ضبط اور فہم پر ہے۔ تیسری شرط آزادی ہے؛ احناف کے کلاسیکی نظام میں غلام کی گواہی قبول نہیں کی جاتی تھی کیونکہ شہادت ایک نوع کی ولایت ہے اور غلام اس کا اہل نہیں سمجھا جاتا تھا، یہ شرط اپنے تاریخی قانونی پس منظر میں بیان ہوتی ہے۔ چوتھی شرط اسلام ہے جب کہ نکاح کرنے والے مسلمان ہوں، یعنی مسلمانوں کے نکاح میں گواہ مسلمان ہونے چاہئیں، کیونکہ غیر مسلم کی گواہی مسلمان کے حق میں اصولاً قبول نہیں کی جاتی۔ ان شرائط کی بنیاد یہ اصول ہے کہ گواہ وہ شخص ہو سکتا ہے جو عدالت میں شہادت دینے کی قانونی اہلیت رکھتا ہو۔ البتہ یہاں ایک اہم نرمی احناف کے ہاں پائی جاتی ہے کہ عدالت یعنی گواہ کا متقی اور پرہیز گار ہونا نکاح کی صحت کی شرط نہیں؛ اگر گواہ فاسق ہوں تب بھی احناف کے نزدیک نکاح منعقد ہو جاتا ہے، کیونکہ نکاح میں گواہی دراصل اثباتِ عقد کے لیے ہے اور فاسق کی خبر فی الجملہ قابلِ قبول ہے، جبکہ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک گواہوں کا عادل ہونا بھی شرط ہے اور فاسق گواہوں کے سامنے کیا گیا نکاح ان کے ہاں درست نہیں ہوتا۔ یہ اختلاف شہادت کی عمومی بحث سے جڑا ہوا ہے جس میں شوافع حدیث لا نکاح الا بولی و شاہدی عدل یعنی ولی اور دو عادل گواہوں کے بغیر نکاح نہیں، سے استدلال کرتے ہیں جبکہ احناف اسے کمال اور استحباب پر محمول کرتے ہیں۔

جدول 1: الہدایہ کے مطابق نکاح کے گواہوں کی شرائط

شرط	تفصیل	وجہ
تعداد	دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں	قرآنی نصابِ شہادت کے مطابق ثبوت کی تکمیل
حاضری و سماع	ایک ہی مجلس میں ایجاب و قبول دونوں کا سننا اور سمجھنا	گواہی کا مقصد واقعے کی سچی خبر ہے
بلوغ و عقل	گواہ بالغ اور عاقل ہو	شہادت کی اہلیت اور ضبط کے لیے

شہادت کو ولایت کی نوعیت دی گئی تھی	کلاسیکی فقہ میں گواہ آزاد ہو	آزادی
غیر مسلم کی گواہی مسلمان کے حق میں مقبول نہیں	مسلمان فریقین کے نکاح میں گواہ مسلمان ہوں	اسلام
فاسق کی شہادت کی قبولیت میں اختلافی امور	احناف کے نزدیک شرط نہیں، امام شافعیؒ کے نزدیک شرط ہے	عدالت

ذمی کے نکاح میں ذمی گواہوں کا مسئلہ

اب سوال کا دوسرا حصہ یہ ہے کہ اگر نکاح کرنے والے مرد اور عورت دونوں ذمی ہوں، یعنی اسلامی مملکت میں رہنے والے غیر مسلم اہلِ ذمہ، تو کیا ان کے نکاح میں دو ذمی گواہ کافی ہوں گے جبکہ ذمی گواہ کی عام شہادت مسلمانوں کے معاملات میں قبول نہیں ہوتی۔ اس مسئلے میں ائمہ احناف کا اختلاف نقل کیا ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور امام محمد رحمہ اللہ کے نزدیک ذمی مرد اور ذمی عورت کا نکاح ذمی گواہوں کی موجودگی میں جائز اور منعقد ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ذمیوں کے باہمی معاملات میں ان کے اپنے دین اور ضابطے کو بھی کسی حد تک اعتبار دیا گیا ہے، اور گواہی کی اہلیت کا تعلق مشہود علیہ یعنی جس کے حق میں گواہی دی جا رہی ہے اس سے ہوتا ہے؛ چونکہ یہاں دونوں فریق ذمی ہیں اور گواہی کسی مسلمان کے خلاف استعمال نہیں ہو رہی، اس لیے ذمی گواہ کی اہلیت اپنے ہم دینوں کے حق میں قائم ہو جاتی ہے۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ اہلِ ذمہ کے نکاح کو شریعت نے فی الجملہ معتبر مانا ہے اور ان کی بیویوں کو ان کے لیے حلال قرار دیا گیا ہے، پس جس عقد کو اصلاً تسلیم کیا گیا ہے اس کے ثبوت کے ذرائع میں بھی ان کی اہلیت کو تسلیم کرنا اصول کے مطابق ہے۔

دوسری طرف امام زفر رحمہ اللہ اور امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک ذمی گواہوں کی موجودگی میں ذمیوں کا نکاح بھی منعقد نہیں ہوتا، کیونکہ شہادت کی اہلیت کے لیے اسلام ان کے نزدیک ایک عمومی شرط ہے اور غیر مسلم سرے سے شہادت کا اہل ہی نہیں، خواہ مشہود علیہ کوئی بھی ہو۔ ان کا استدلال اس عام اصول سے ہے کہ گواہی ایک دینی و قانونی ولایت ہے جو غیر مسلم کو حاصل نہیں، اور قرآن مجید نے گواہوں کے لیے تم میں سے یعنی مسلمانوں میں سے ہونے کی قید بھی بیان فرمائی ہے (المائدہ: 106 کے مفہوم کے

تناظر میں مختلف آیات کی مجموعی رہنمائی)۔ اس کے بالمقابل صاحبین یعنی امام ابو حنیفہ و امام محمد رحمہما اللہ کا مؤقف زیادہ وسعت رکھتا تھا اور حنفی فقہ میں اسی پر فتویٰ رہا ہے، کیونکہ اسلامی ریاست میں رہنے والے ذمیوں کے عائلی معاملات کو ان کے اپنے ضابطوں کے ساتھ چلانا ہی انصاف اور امنِ عامہ کا تقاضا تھا۔ یہ نکتہ بھی یاد رہے کہ اگر ایک فریق مسلمان ہو اور دوسرا ذمی، مثلاً مسلمان مرد کتابیہ عورت سے نکاح کرے، تو اس صورت میں گواہوں کا مسلمان ہونا ضروری ہو گا، کیونکہ اب گواہی ایک مسلمان کے حق و عقد سے متعلق ہے اور اس میں ذمی گواہ کی اہلیت پر اتفاق نہیں بلکہ احناف کے ہاں بھی مسلمان گواہ ہی معتبر ہیں۔ اس تفصیل سے واضح ہوتا ہے کہ ذمی گواہوں کی اہلیت کا مسئلہ فریقین کی دینی حیثیت سے مشروط ہے۔

گواہی کے دیگر متعلقہ احکام

اس بحث سے جڑے چند مزید احکام بھی الہدایہ میں مذکور ہیں جن کا جاننا طالب علم کے لیے مفید ہے۔ ایک یہ کہ اگر گواہ نکاح پر گواہ مقرر نہ تھے مگر بعد میں دونوں فریق اس عقد کا اقرار کر لیں تو اقرار سے نکاح ثابت ہو جاتا ہے، کیونکہ اقرار شہادت سے قوی دلیل ہے۔ دوسرا یہ کہ گواہوں کا ایک دوسرے کی موجودگی سے لاعلم ہونا یا عقد کے الفاظ کو یاد نہ رکھنا بعد میں اگر جھگڑا ہو تو فریق کی مشکلات بڑھا دیتا ہے، اسی لیے مستحب یہ ہے کہ گواہ معروف، سمجھدار اور حاضر دماغ افراد ہوں۔ تیسرا یہ کہ عورتوں کی گواہی کو نکاح میں شامل کرنا احناف اور جمہور کے ہاں جائز ہے، جبکہ بعض اہلِ علم مثلاً ظاہریہ اور ایک روایت میں دیگر ائمہ کے ہاں عورتوں کی گواہی نکاح میں قبولیت کے درجے میں اختلافی رہی ہے، لیکن کتاب کا اعتماد احناف کے مسلک پر ہے۔ چوتھا یہ کہ گواہی کی شرط کا مقصد محض رسمی نہیں؛ اس سے نکاح کو تحفظ، سماجی قبولیت اور قانونی حیثیت ملتی ہے، اور جدید دور میں سرکاری اندراج یعنی رجسٹریشن اسی مقصد کی ایک عصری شکل ہے جسے شرائطِ گواہی کے مقاصد کے تحت سمجھا جا سکتا ہے، البتہ شرعی انعقاد کا مدار فقہی شرائط ہی پر رہتا ہے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ الہدایہ کے مطابق نکاح کے گواہ دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں ہوں، وہ بالغ، عاقل، آزاد اور مسلمان فریقین کی صورت میں مسلمان ہوں، اور وہ ایک ہی مجلس میں ایجاب و قبول سن کر سمجھنے کی حالت میں حاضر ہوں؛ عدالت احناف کے نزدیک شرطِ صحت نہیں جبکہ امام شافعی رحمہ اللہ اسے بھی لازم قرار دیتے ہیں۔ ذمی گواہوں کے مسئلے میں امام ابو حنیفہ اور امام محمد رحمہما اللہ ذمی فریقین کے باہمی نکاح میں ذمی گواہوں کو کافی سمجھتے ہیں جبکہ امام زفر اور امام شافعی رحمہما اللہ کے نزدیک غیر مسلم سرے سے شہادت کا اہل نہیں۔ یہ اختلاف گواہی کی اہلیت کے اصولوں میں اجتہادی تنوع کی عمدہ مثال ہے، اور ایک طالب علم کا کام یہ ہے کہ وہ ہر فریق کی دلیل کو سمجھ کر اپنے مسلک کے مفتیٰ بہ قول پر عمل کرے۔

سوال نمبر 3: نکاح میں ولی کے اختیارات اور خیارِ بلوغ (20 نمبر)

سوال نمبر 3: کتاب الہدایہ کی روشنی میں نکاح میں ولی کے اختیارات کی وضاحت کریں اور واضح کریں کہ باپ دادا کے کروائے ہوئے نکاح اور دیگر اولیاء کے کروائے ہوئے نکاح میں خیارِ بلوغ کے لحاظ سے کیا فرق ہے؟ (20)

تعارف

ولایت نکاح کے اہم ترین مباحث میں سے ہے، کیونکہ اسی سے یہ طے ہوتا ہے کہ نابالغ کا نکاح کون کر سکتا ہے، بالغہ عورت کا نکاح کس کی موجودگی میں افضل و اکمل ہے، اور کس صورت میں نکاح کیے جانے کے بعد اس عقد کو برقرار رکھنے یا ختم کرانے کا اختیار پیدا ہوتا ہے۔ الہدایہ کے کتاب النکاح میں ولایت کی بحث بڑی وضاحت سے آئی ہے اور اس میں احناف کا مسلک امام شافعی رحمہ اللہ کے مسلک سے نمایاں طور پر مختلف ہے۔ اس سوال میں دو باتیں درکار ہیں: ایک ولی کے اختیارات کی وضاحت، اور دوسرے یہ کہ نابالغ کے نکاح میں اگر عقد باپ یا دادا نے کروایا ہو تو اس کا حکم کیا ہے اور اگر دیگر اولیاء نے کروایا ہو تو خیارِ بلوغ کے لحاظ سے کیا فرق پڑتا ہے۔ یہ بحث بھی تعلیمی اور علمی ہے؛ خاندان کے کسی اصل تنازع میں فیصلہ اہلِ علم اور بااختیار عدالت کے ذریعے ہونا چاہیے۔

ولی کی تعریف، درجہ بندی اور ولایت کی بنیاد

ولی سے مراد وہ قریبی رشتہ دار ہے جسے شریعت نے کم سن یا غیر کامل الاہلیت شخص کے نکاح کا عقد کرنے کا اختیار دیا ہے۔ احناف کے نزدیک ولایتِ نکاح کا استحقاق عصبہ رشتہ داروں کو اسی ترتیب سے حاصل ہوتا ہے جو وراثت میں عصبہ کی ترتیب ہے، یعنی سب سے پہلے بیٹا اور اس کی اولاد پھر باپ، دادا، پھر بھائی اور ان کی اولاد، پھر چچا اور اس کی اولاد، اس کے بعد دور کے عصبہ، پھر ماں اور دیگر ذوی الارحام، اور ان سب کے نہ ہونے پر حاکم یا قاضی ولی ہوتا ہے، کیونکہ حدیث میں حاکم کو اس شخص کا ولی قرار دیا گیا ہے جس کا کوئی ولی نہ ہو (ترمذی و ابو داؤد کے مفہوم کے مطابق)۔ اس ترتیب کی وجہ یہ ہے کہ جو رشتہ دار قرابت اور ہمدردی میں سب سے قریب ہے اسی کو نکاح جیسے اہم فیصلے کا ذمہ دار بنایا جائے۔ ولایت کی بنیاد عقل، بلوغ اور اسلام ہیں؛ نابالغ، مجنون یا غیر مسلم شخص مسلمان بچی کا ولی نہیں بن سکتا۔ ولی کے لیے یہ بھی ضروری سمجھا گیا ہے کہ وہ آزاد ہو، اور اس کا فیصلہ ظلم و زیادتی پر مبنی نہ ہو، کیونکہ ولایت کی اصل روح حفاظت اور خیر خواہی ہے، جبر و استبداد نہیں۔

ولی کے اختیارات: نابالغ کے نکاح میں اجبار

احناف کے نزدیک ولی کو نابالغ لڑکے یا نابالغ لڑکی کا نکاح کرانے کا اختیار حاصل ہے، چاہے لڑکی باکرہ ہو یا ثیبہ، کیونکہ نابالغ اپنے معاملے کی مصلحت سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتا اور اس کی دیکھ بھال ولی کے سپرد ہے۔ اس ولایت کو ولایتِ اجبار کہا جاتا ہے، یعنی ولی نابالغ کی رضامندی کے بغیر بھی اس کا نکاح کر سکتا ہے اور یہ نکاح صحیح، نافذ اور لازم ہوتا ہے۔ البتہ اس اختیار کے ساتھ شرعی قیدیں بھی ہیں: نکاح کفو میں ہو، مہر مہرِ مثل سے فاحش کمی کے ساتھ مقرر نہ ہو، اور ولی اپنے فیصلے میں بدنامِ سوءِ اختیار یعنی غلط چناؤ کے لیے مشہور نہ ہو۔ اگر ولی ان حدود سے تجاوز کرے تو بعض صورتوں میں نابالغ کو بلوغ کے بعد اختیار مل جاتا ہے جس کی تفصیل آگے آتی ہے۔ یہاں یہ بات بھی واضح رہے کہ بالغ و عاقلہ عورت کے بارے میں احناف کا موقف یہ ہے کہ وہ اپنا نکاح خود کر سکتی ہے، البتہ یہ نکاح اس وقت لازم ہوتا ہے جب شوہر اس کا کفو ہو؛ اگر وہ غیر کفو میں اپنا نکاح خود کر لے تو ولی کو عدالت کے ذریعے اس عقد کے فسخ کا مطالبہ کرنے کا حق حاصل ہوتا ہے، جس کی بنیاد کفاءت کی بحث ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک بالغہ کا نکاح بھی ولی ہی کی ولایت سے ہوتا ہے اور ولی کے بغیر کیا گیا نکاح باطل ہوتا ہے؛ دونوں مواقف کی دلیلیں پچھلے سوال میں گزر چکی ہیں۔

جدول 1: ولایتِ نکاح کی ترتیب (احناف کے مطابق)

درجہ	ولی	نوٹ
1	بیٹا، پوتا (نابالغ کے معاملے میں سب سے پہلے عصبہ اقرب)	ترتیب وراثت کے عصبہ کے مطابق
2	باپ، پھر دادا	ان کے کروائے نکاح میں خیارِ بلوغ نہیں (شرائط کے ساتھ)
3	بھائی، جیتے	دیگر اولیاء — ان کے نکاح میں خیارِ بلوغ حاصل ہوتا ہے
4	چچا، چچازاد	عصبہ بعید
5	ماں و دیگر ذوی الارحام، پھر حاکم / قاضی	عصبہ نہ ہوں تو ان کی ولایت

خیارِ بلوغ کا مفہوم اور عمومی شرائط

خیارِ بلوغ سے مراد وہ اختیار ہے جو نابالغ کو بالغ ہونے پر حاصل ہوتا ہے کہ وہ اپنے اس نکاح کو برقرار رکھے یا ختم کر دے جو اس کی نابالغی میں اس کے ولی نے کروایا تھا۔ اس اختیار کی شرائط میں یہ باتیں شامل ہیں: اول یہ کہ نابالغ کو بالغ ہونے کے بعد اپنے نکاح کی خبر ہو، کیونکہ لاعلمی میں اختیار ساقط نہیں ہوتا۔ دوم یہ کہ لڑکی کے معاملے میں اسے بالغ ہوتے ہی اور نکاح کی خبر ملتے ہی فوراً اپنا اختیار استعمال کرنا چاہیے؛ اگر وہ خبر ملنے کے بعد خاموش رہے یا رضامندی کا کوئی قرینہ ظاہر ہو جائے تو اس کا اختیار ختم ہو جاتا ہے، کیونکہ بکر کی خاموشی کو بھی عام اصول میں رضا کی علامت سمجھا گیا ہے، البتہ لڑکے کے خیار کے بارے میں مدت کی بحث میں تفصیل موجود ہے اور ایک موقف یہ ہے کہ اسے

عدالت سے رجوع تک تاخیر کی گنجائش رہتی ہے۔ سوم یہ کہ نکاح کا خاتمہ خیارِ بلوغ سے خود بخود نہیں ہوتا بلکہ احناف کے نزدیک اس کے لیے قاضی کا فیصلہ ضروری ہے، کیونکہ یہ فسخ ہے اور فسخ کا اختیار عدالت کو ہوتا ہے؛ جب تک قاضی فیصلہ نہ کرے نکاح کا ظاہری حکم باقی رہتا ہے۔ چہارم یہ کہ اگر بالغ ہونے کے بعد دونوں فریق رضامندی سے ازدواجی زندگی گزارنے لگیں تو اختیار ختم ہو جاتا ہے۔ (۱۰) شرائط سے ظاہر ہے کہ خیارِ بلوغ نابالغ کے تحفظ کا ایک محتاط اور متوازن نظام ہے جو نہ نکاح کو کھیل بناتا ہے اور نہ نابالغ کو زندگی بھر اس عقد کا پابند جس میں اس کی رائے شامل ہی نہیں تھی۔

باپ دادا کے نکاح اور دیگر اولیاء کے نکاح میں فرق

اب سوال کا مرکزی نکتہ یہ ہے کہ نابالغ کا نکاح باپ یا دادا نے کروایا ہو تو اس کا حکم دیگر اولیاء سے مختلف ہے۔ الہدایہ کے مطابق اگر نکاح باپ یا دادا نے کروایا ہو تو نابالغ کو بالغ ہونے پر خیارِ بلوغ حاصل نہیں ہوتا، اور یہ نکاح مکمل طور پر لازم ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ باپ اور دادا کی شفقت اور خیر خواہی کامل ہوتی ہے؛ وہ اولاد کے لیے ایسا فیصلہ کر سکتے ہیں جیسا اپنے لیے کریں، اور ان کے سوءِ اختیار کا احتمال عام طور پر نہیں ہوتا۔ البتہ اس اصول کی ایک اہم استثنا بھی ہے: اگر باپ یا دادا اپنے بیٹے یا پوتے کے لیے مشہور ہو، یعنی عادتاً غلط اور نقصان دہ فیصلے کرنے والا ہو، یا اس نے نکاح غیر کفو میں کر دیا ہو، یا مہرِ مثل میں فاحش کمی کی ہو، تو ایسی صورت میں اس کا کروایا نکاح بھی لازم نہیں رہتا اور نابالغ کو بلوغ پر اختیار مل جاتا ہے، کیونکہ ولایت کی بنیاد خیر خواہی ہے اور جہاں وہ بنیاد ہی ختم ہو جائے وہاں لازمیت کی وجہ بھی باقی نہیں رہتی۔ شرائط کے ساتھ یہ لازمیت دراصل باپ دادا کے فیصلے کو اعتماد دینے اور خاندانی استحکام کو برقرار رکھنے کے لیے ہے، ورنہ ہر نکاح بلوغ کے بعد از سرِ نو متنازع بن جاتا۔

اس کے برعکس اگر نابالغ کا نکاح باپ دادا کے علاوہ کسی اور ولی نے کروایا ہو، مثلاً بھائی، چچا یا ماں نے، تو اس صورت میں نابالغ، لڑکا ہو یا لڑکی، بالغ ہوتے ہی خیارِ بلوغ کا حقدار ہو جاتا ہے اور وہ چاہے تو عدالت کے ذریعے اس نکاح کو ختم کر سکتا ہے۔ اس فرق کی حکمت یہ ہے کہ دیگر رشتہ داروں کی شفقت باپ دادا کے درجے کی نہیں ہوتی اور ان سے فیصلے میں کوتاہی یا ذاتی مفاد کا احتمال زیادہ ہوتا ہے، اس لیے شریعت نے نابالغ کو بلوغ کے بعد اپنے مستقبل کا فیصلہ خود کرنے کا موقع دیا۔ اس مسئلے میں فقہاء کے درمیان ایک اور اختلاف بھی قابلِ ذکر ہے: امام ابو حنیفہ اور امام محمد رحمہما اللہ کے نزدیک خیارِ بلوغ لڑکے اور لڑکی دونوں کو حاصل ہوتا ہے، جبکہ اس باب میں بعض روایات و آراء میں لڑکے

کے بارے میں تردد ملتا ہے، لیکن حنفی کتابوں میں راجح اور مفتی بہ صورت یہی ہے کہ دیگر اولیاء کے کروائے نکاح میں دونوں کو اختیار حاصل ہے۔ اسی طرح اگر نکاح کرنے والا ولی موجود ہی نہ ہو اور کسی اجنبی نے فضولی کے طور پر عقد کر دیا ہو تو وہ نکاح موقوف رہتا ہے، نابالغ کے بلوغ کے بعد اس کی اجازت پر اس کا نفاذ منحصر ہوتا ہے، یہ الگ مسئلہ ہے جسے خیارِ بلوغ سے خلط نہیں کرنا چاہیے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ الہدایہ کے مطابق ولی عصبہ کی ترتیب سے نابالغ کے نکاح کا عقد کرنے کا اختیار رکھتا ہے اور اس کا یہ نکاح کفو اور مہرِ مثل کی حدود میں لازم ہوتا ہے، جبکہ بالغہ عورت احناف کے ہاں خود بھی عقد کر سکتی ہے۔ خیارِ بلوغ میں فیصلہ کن فرق ولی کی نسبت کا ہے: باپ یا دادا کے کروائے نکاح میں، بشرطیکہ وہ سوءِ اختیار کے لیے مشہور نہ ہو اور نکاح کفو و مہر کے لحاظ سے درست ہو، خیارِ بلوغ حاصل نہیں ہوتا؛ دیگر تمام اولیاء کے کروائے نکاح میں نابالغ کو بلوغ کے فوراً بعد دارالقضاء یا عدالت کے ذریعے نکاح ختم کرنے کا اختیار حاصل ہوتا ہے۔ یہ متوازن ضابطہ ایک طرف خاندانی سرپرستی کا احترام برقرار رکھتا ہے اور دوسری طرف نابالغ کے مستقبل کو بُرے محفوظ بناتا ہے۔

سوال نمبر 4: نکاح میں کفاءت (برابری) اور اولیاء کے حقوق (20 نمبر)

سوال نمبر 4: "الہدایہ" کی روشنی میں نکاح میں کفاءت (برابری) کا مفہوم بیان کریں اور بتائیں کہ عورت کے غیر کفو میں نکاح کرنے کی صورت میں اولیاء کو کیا حقوق اور اعتراض کے اختیارات حاصل ہیں؟ (20)

تعارف

خاندانی زندگی کے استحکام کا دارومدار صرف عقد کے صحیح ہونے پر نہیں ہوتا بلکہ میاں بیوی کے درمیان دینی، اخلاقی، سماجی اور معاشی ہم آہنگی پر بھی ہوتا ہے۔ اسی ہم آہنگی کی ایک اہم جہت کو فقہ میں کفاءت کہا جاتا ہے، یعنی شوہر کا بیوی کے ہم پلہ اور برابر ہونا۔ الہدایہ کے کتاب النکاح میں کفاءت کی بحث ولایت کے ساتھ جڑی ہوئی آئی ہے، کیونکہ

کفاءت کا عملی اثر سب سے زیادہ اسی وقت ظاہر ہوتا ہے جب کوئی عورت اپنے ولی کی مرضی کے بغیر خود کسی غیر کفو مرد سے نکاح کر لے۔ اس سوال میں دو امور مطلوب ہیں: کفاءت کا مفہوم اور اس کے معیارات، اور غیر کفو میں نکاح کی صورت میں اولیاء کو حاصل حقوق و اختیارات۔ یہ بحث علمی و تعلیمی ہے؛ کسی اصل رشتے کو فسخ کرانے یا برقرار رکھنے کا فیصلہ ذاتی رائے سے نہیں بلکہ اہلِ علم اور باقاعدہ عدالت کے ذریعے ہوتا ہے۔

کفاءت کا لغوی و اصطلاحی مفہوم

کفاءت عربی لفظ کُفو سے بنا ہے جس کے معنی برابر، مثل اور ہم پلہ کے ہیں۔ فقہی اصطلاح میں کفاءت سے مراد یہ ہے کہ مرد دینی و دنیوی اعتبار سے عورت کے برابر یا اس کے خاندانی معیار کے مطابق ہو، تاکہ دونوں کے درمیان الف، موانست اور سماجی سکون پیدا ہو سکے اور عورت اور اس کے خاندان کو سماجی طور پر عار اور نقصان نہ پہنچے۔ الہدایہ میں کفاءت کی دلیل یہ بیان کی گئی ہے کہ نکاح کے مقاصد، یعنی باہمی محبت، اولاد کی تربیت اور خاندانوں کے ربط، اسی وقت پورے ہوتے ہیں جب فریقین میں مناسب ہم آہنگی ہو، اور حدیث میں بھی نکاح کے انتخاب میں دین و اخلاق کو ترجیح دینے اور ہم پلہ رشتے کی طرف رہنمائی ملتی ہے۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ کفاءت کو اسلام میں ذاتی برتری یا انسانی قدر کا معیار نہیں بنایا گیا؛ قرآن مجید نے عزت کا اصل معیار تقویٰ قرار دیا ہے (الحجرات: 13 کے مفہوم کے مطابق)۔ کفاءت ایک دنیوی انتظامی اور سماجی مصلحت ہے جس کا مقصد ازدواجی زندگی کو ٹوٹ پھوٹ سے بچانا ہے، یہ کسی انسان کو کم تر یا حقیر سمجھنے کا جواز نہیں ہے۔

کفاءت کے معیارات

الہدایہ اور حنفی فقہ کے مطابق مرد میں کفاءت جن امور میں دیکھی جاتی ہے وہ یہ ہیں۔ اول دیانت یعنی دین داری؛ فاسق و فاجر مرد دیندار اور صالحہ عورت کا کفو نہیں ہوتا، کیونکہ زندگی کا سب سے بنیادی اشتراک دین ہے اور دین میں ناہم آہنگی ازدواجی زندگی کو براہِ راست متاثر کرتی ہے۔ دوم نسب؛ خاندانی پس منظر کا اعتبار عرف کے لحاظ سے کیا جاتا ہے، کیونکہ خاندانوں کے سماجی مرتبے میں واضح فرق بسا اوقات خاندانی کشمکش کا سبب بنتا ہے، البتہ یہ اعتبار زمانے اور علاقے کے عرف کے تابع ہے۔ سوم پیشہ و حرفت؛ جس پیشے کو معاشرے میں عرفاً کم تر سمجھا جاتا ہو اس کے حامل کو بلند سماجی پیشے والے خاندان کی عورت کا کفو نہ سمجھا جانا بھی کفاءت کے باب میں مذکور ہے اور یہ بھی خالصتاً

عرف پر مبنی ہے۔ چہارم مال؛ اس سے مراد خاندانی دولت کی نمائش نہیں بلکہ یہ ہے کہ مرد مہر ادا کرنے اور بیوی کا نان و نفقہ پورا کرنے کی استطاعت رکھتا ہو، کیونکہ معاشی نااہلی ازدواجی زندگی کی بنیادی ضرورت کو متاثر کرتی ہے۔ پنجم آزادی، جو کلاسیکی دور کی قانونی تقسیم میں ایک حیثیت تھی اور آج کے دور میں اس کا عملی اطلاق باقی نہیں رہا۔ ان معیارات سے دو اصول نکلتے ہیں: ایک یہ کہ کفاءت کا اعتبار مرد کی طرف سے ہوتا ہے، یعنی مرد کا عورت کے برابر ہونا دیکھا جاتا ہے، کیونکہ عام طور پر عورت شوہر کے گھر اور ماحول میں منتقل ہوتی ہے؛ دوسرا یہ کہ کفاءت نکاح کے وقت دیکھی جاتی ہے، بعد میں پیدا ہونے والی تبدیلی سے صحیح شدہ نکاح متاثر نہیں ہوتا۔

جدول 1: کفاءت کے معیارات اور ان کی بنیاد

بنیاد	مفہوم	معیار
ازدواجی ہم آہنگی کی بنیادی شرط	مرد کا دین و اخلاق میں عورت کے ہم پلہ ہونا	دیانت
عرف و سماجی مصلحت	خاندانی پس منظر کی مماثلت	نسب
عرف کے مطابق، زمانے کے ساتھ بدلتا ہے	حرفت و روزگار کا سماجی معیار	پیشہ
ازدواجی ذمہ داریوں کی ادائیگی	مہر و نفقہ کی استطاعت	مال
تاریخی پس منظر، آج اطلاق نہیں	کلاسیکی قانونی حیثیت	آزادی

غیر کفو میں نکاح کی صورتیں اور اولیاء کے حقوق

اب سوال کا دوسرا حصہ ہے۔ احناف کے نزدیک اگر بالغ و عاقلہ عورت خود اپنا نکاح کسی ایسے مرد سے کر لے جو اس کا کفو نہ ہو، تو وہ نکاح منعقد تو ہو جاتا ہے کیونکہ عورت عقد کی اہل ہے، لیکن وہ ولی کے حق میں لازم و ناقابلِ اعتراض نہیں رہتا؛ ولی کو حق حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ عدالت میں اس نکاح کے فسخ کا مطالبہ کرے۔ یہ اعتراض کا حق اصل میں عورت کی اہلیت کی نفی نہیں بلکہ اس مصلحت کا تحفظ ہے کہ عورت نے وقتی جذبات یا لاعلمی میں ایسا فیصلہ نہ کر لیا ہو جس کا خمیازہ اسے اور اس کے خاندان کو عمر بھر بھگتنا پڑے۔

اس کے برعکس اگر عورت نے ولی ہی کی اجازت اور رضامندی سے غیر کفو میں نکاح کیا ہو تو پھر ولی کو اعتراض کا حق نہیں رہتا، کیونکہ وہ خود اس فیصلے میں شریک رہا ہے اور اپنے حق کو رضامندی سے ساقط کر چکا ہے۔ اسی طرح اگر عورت کا نکاح کفو میں ہوا ہو اور ولی بعد میں محض ذاتی پسند ناپسند کی بنیاد پر اعتراض کرے تو اس کا اعتراض قبول نہیں ہوتا، کیونکہ کفاءت کی شرط پوری ہونے کے بعد ولی کا حقِ اعتراض ختم ہو جاتا ہے۔

اولیاء کے اس حق کے بارے میں چند ضوابط بھی ذکر کرنا ضروری ہے۔ پہلا ضابطہ یہ ہے کہ اعتراض کا حق تمام اولیاء کو یکساں نہیں ملتا، بلکہ جو ولی سب سے قریب ہے یعنی ولی اقرب، اسی کا اعتراض معتبر ہوتا ہے، بشرطیکہ وہ خود عقد میں شریک نہ رہا ہو۔ دوسرا ضابطہ یہ ہے کہ ولی کا یہ حق ایک خاص حد تک باقی رہتا ہے؛ الہدایہ کے مطابق اگر اس غیر کفو نکاح سے عورت حاملہ ہو جائے یا بچہ پیدا ہو جائے تو پھر فسخ کا حق ساقط ہو جاتا ہے، کیونکہ اب معاملہ صرف دو افراد کا نہیں رہا بلکہ ایک نئی زندگی اور نسب کے حقوق اس سے وابستہ ہو چکے ہیں اور نکاح کا فسخ اب مصلحت کے بجائے مفسدے کا سبب بنے گا۔ تیسرا ضابطہ یہ ہے کہ فسخ کا فیصلہ ولی خود نہیں کر سکتا؛ اسے عدالت سے رجوع کرنا پڑتا ہے اور قاضی تمام حالات سن کر فیصلہ دیتا ہے، جس سے اس حق کے غلط استعمال کی راہ بند ہوتی ہے۔ چوتھا ضابطہ یہ ہے کہ اگر نابالغ کا نکاح اس کے ولی نے غیر کفو میں کر دیا ہو تو صورت مختلف ہے اور وہ خیارِ بلوغ کی بحث سے جڑتی ہے جو پچھلے سوال میں بیان ہوئی۔ ان ضوابط سے واضح ہے کہ شریعت نے کفاءت کو نہ تو اتنا سخت بنایا کہ ہر نکاح مشکوک ہو جائے اور نہ اتنا ڈھیلا چھوڑا کہ خاندانی مصالح یکسر نظر انداز ہو جائیں۔

ائمہ کے مابین اختلاف اور کفاءت کی عصری حیثیت

کفاءت کے مسئلے میں ائمہ کے ہاں تنوع پایا جاتا ہے جس کا ذکر طالب علم کے لیے مفید ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک بھی کفاءت معتبر ہے، البتہ ان کے ہاں چونکہ بالغہ کا نکاح ولی ہی کرتا ہے، اس لیے مسئلہ ولی کی اجازت سے حل ہو جاتا ہے اور عورت کے خود کردہ نکاح کا سوال سرے سے پیدا نہیں ہوتا۔ امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک کفاءت کا اصل معیار دین ہے؛ ان کے ہاں دنیوی معیارات کو وہ حیثیت نہیں دی گئی جو احناف کے ہاں عرف کی بنیاد پر دی گئی ہے۔ اسی طرح بعض فقہاء اور محققین نے یہ رائے بھی اختیار کی ہے کہ نسب و پیشے کی کفاءت زمانے کے عرف سے جڑی ہے، جب عرف بدل جائے تو حکم کی عملی صورت بھی بدل سکتی ہے، جبکہ دیانت اور اخلاق کا معیار ہر زمانے میں

برقرار رہتا ہے۔ پاکستان سمیت کئی مسلم ممالک میں یہ مسئلہ عموماً خاندانی رضامندی اور عدالت کی صوابدید کے تحت نمٹایا جاتا ہے، اور جدید قانونی نظاموں میں بالغ عورت کی رضامندی کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ طالب علم کو اس بحث میں یہ توازن یاد رکھنا چاہیے کہ فقہی نصوص اپنی جگہ معتبر ہیں، مگر ان کا اطلاق ہمیشہ زمانے کے عرف، فریقین کی دینی حالت اور عدالتی تحقیق کے ساتھ ہوتا ہے، اور [illegible] یا خاندانی غرور کو کفاءت کی آڑ میں شرعی جواز نہیں دیا جا سکتا۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ الہدایہ کی روشنی میں کفاءت سے مراد شوہر کا بیوی کے دین، نسب، پیشہ اور معاشی استطاعت میں عرف کے مطابق ہم پلہ ہونا ہے، اور اس کا مقصد ازدواجی ہم آہنگی اور خاندانی استحکام ہے، انسانی برتری کا دعویٰ نہیں۔ اگر بالغہ عورت ولی کی اجازت کے بغیر غیر کفو میں نکاح کر لے تو اس کے ولی اقرب کو عدالت کے ذریعے فسخ کا مطالبہ کرنے کا حق حاصل ہوتا ہے، البتہ یہ حق ولی کی اپنی رضامندی کی صورت میں ساقط ہو جاتا ہے اور حمل یا ولادت کے بعد بھی باقی نہیں رہتا۔ یہ ضابطہ عورت کی اہلیت، خاندان کی مصلحت اور بچوں کے حقوق کے درمیان ایک متوازن حل پیش کرتا ہے جو حنفی فقہ کی عملی حکمت کی خوب صورت مثال ہے۔

سوال نمبر 5: مہر کی شرعی حیثیت، کم از کم مقدار اور طلاق کی صورتوں میں احکام (20 نمبر)

سوال نمبر 5: کتاب الہدایہ کی روشنی میں مہر کی شرعی حیثیت اور اس کی کم از کم مقدار بیان کریں، نیز خلوتِ صحیحہ کے بعد یا خلوت سے پہلے طلاق کی صورت میں مہرِ مسمّٰی اور مہر المثل کے احکام واضح کریں۔ (20)

تعارف

مہر اسلامی نکاح کے نمایاں ترین مالی احکام میں سے ہے اور یہی وہ حق ہے جس نے عورت کو نکاح کے عقد میں ایک مستقل مالی حیثیت عطا کی ہے۔ مہر عورت کی عزت و تکریم کی علامت بھی ہے اور اس کے معاشی تحفظ کا ذریعہ بھی، اور یہ شوہر پر واجب ہوتا ہے، عورت یا اس کے خاندان پر نہیں۔ الہدایہ کے کتاب النکاح میں مہر کی مشروعیت، اس کی کم

از کم مقدار، مہر مسمّٰی اور مہر المثل کا فرق، اور خلوتِ صحیحہ سے پہلے یا بعد طلاق کی صورتوں میں مہر کے احکام تفصیل سے بیان ہوئے ہیں۔ سوال میں یہی مباحث درکار ہیں۔ یہاں یہ وضاحت بھی مناسب ہے کہ مہر سے متعلق اصل رقوم اور دعوے کسی معین کیس میں عدالت اور اہلِ علم کے سامنے طے ہوتے ہیں؛ یہ جواب فقہی اصولوں کی تعلیمی وضاحت ہے۔

مہر کی تعریف اور شرعی حیثیت

فقہی اصطلاح میں مہر وہ مال ہے جو نکاح کے عقد کی وجہ سے عورت کا حق بن کر شوہر کے ذمے واجب ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا کہ عورتوں کو ان کے مہر خوشی سے دیا کرو (النساء: 4 کے مفہوم کے مطابق)، اور یہ بھی واضح فرمایا کہ اگر تم نے انہیں خزانہ بھی دیا ہو تو اس میں سے کچھ واپس نہ لو (النساء: 20 کے مفہوم کے مطابق)۔ انہی آیات سے فقہاء نے مہر کو نکاح کا واجب مالی اثر قرار دیا ہے۔ الہدایہ کے مطابق مہر نکاح کی صحت کی شرط تو نہیں کہ اس کے ذکر کے بغیر نکاح ہی نہ ہو، کیونکہ مہر کا ذکر کیے بغیر کیا گیا نکاح بھی صحیح ہوتا ہے اور اس صورت میں عورت کو مہر مثل ملتا ہے، لیکن مہر واجب ضرور ہے، یعنی نکاح کے عقد کے ساتھ ہی عورت کا حق ثابت ہو جاتا ہے چاہے عقد میں اس کا نام لیا گیا ہو یا نہ ہو۔ مہر کی یہ حیثیت اسے ہدیے اور تحفے سے الگ کرتی ہے؛ ہدیہ رضامندی پر ہوتا ہے اور مہر قانونی وجوب پر۔ مہر کی ادائیگی میں ٹال مٹول کو فقہاء نے ناپسندیدہ قرار دیا ہے اور زوجین کی باہمی رضامندی سے مہر کا کچھ حصہ معجل یعنی فوری اور کچھ مؤجل یعنی مؤخر رکھنا بھی جائز سمجھا گیا ہے، جیسا کہ ہمارے معاشرے میں دستور ہے۔

مہر کی کم از کم مقدار

الہدایہ کے مطابق مہر کی کم از کم مقدار دس درہم ہے۔ اس سے کم مقدار مہر مقرر نہیں ہو سکتی؛ اگر فریقین اس سے کم پر اتفاق کر لیں تو شرعاً دس درہم ہی واجب ہوں گے، کیونکہ اس مقدار سے کم کی کوئی شرعی حیثیت نہیں۔ اس مقدار کی بنیاد وہ احادیث اور آثار ہیں جن میں مہر کی اس کم ترین حد کا ذکر آیا ہے اور اس اصول پر کہ مہر ایک بامعنی مال ہونا چاہیے، ایسی حقیر رقم نہیں جس کا کوئی وقع نہ ہو، بالکل اسی طرح جیسے چوری میں حد کے لیے ایک نصاب مقرر ہے۔ چاندی کے درہم سے اس مقدار کا اندازہ لگانا اصل مقصد

ہے، اس لیے جدید دور میں دس درہم کے مساوی چاندی کی قیمت کو بنیاد بنایا جاتا ہے، جس کا حساب اہلِ علم اور مفتیانِ کرام موجودہ اوزان کے مطابق بتاتے ہیں؛ یہاں کسی حتمی رقمی عدد کا اعلان اس گائیڈ کا موضوع نہیں، کیونکہ چاندی کی قیمت بدلتی رہتی ہے۔ دوسری طرف مہر کی زیادہ سے زیادہ کوئی حد مقرر نہیں؛ فریقین باہمی رضامندی سے جتنا چاہیں مقرر کر سکتے ہیں، اگرچہ فقہاء نے مہر میں مبالغہ اور نمائش کو ناپسند کیا ہے اور سادگی کو افضل قرار دیا ہے۔ اس مسئلے میں ائمہ کا اختلاف بھی قابل ذکر ہے: امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک مہر کی کوئی کم از کم حد مقرر نہیں، جو چیز بھی مال بن سکے وہ مہر ہو سکتی ہے، جبکہ امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک کم از کم مقدار تین درہم کے قریب مقرر ہے؛ احناف کی دس درہم کی تحدید ان کے دلائل پر مبنی ہے اور حنفی حلقے میں اسی پر عمل ہے۔

مہرِ مسمّیٰ اور مہرُ المثل کی تعریف

اس سوال کے اہم اجزاء کو سمجھنے کے لیے دو اصطلاحات کا فرق واضح ہونا ضروری ہے۔ مہرِ مسمّیٰ وہ مہر ہے جو عقدِ نکاح کے وقت فریقین کی رضامندی سے نام لے کر مقرر کیا گیا ہو، خواہ وہ نقد رقم ہو، زیور ہو یا کوئی متعین مال۔ مہرُ المثل وہ مہر ہے جو اس صورت میں مقرر کیا جائے جب عقد میں مہر کا ذکر ہی نہ ہو یا مقرر کردہ چیز شرعاً مہر بننے کے قابل نہ ہو؛ اس کی مقدار کا تعین عورت کے خاندان کی ہم پلہ عورتوں، مثلاً اس کی بہن، پھوپھی اور چچازاد بہنوں کے مہروں کو دیکھ کر کیا جاتا ہے، اور اس میں اس عورت کی عمر، حسن، دین داری، تعلیم اور سماجی حیثیت جیسی خصوصیات کو بھی ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ خلوتِ صحیحہ سے مراد شوہر اور بیوی کا کسی ایسی جگہ تنہا ہونا ہے جہاں صحبت میں کوئی شرعی، طبعی یا حسی مانع موجود نہ ہو؛ فقہاء نے خلوتِ صحیحہ کو مہر کے باب میں صحبت کے قائم مقام قرار دیا ہے، یعنی اس کے بعد مہر پورا کا پورا ثابت ہو جاتا ہے۔ ان تینوں اصطلاحات کو سامنے رکھ کر اب طلاق کی صورتوں کے احکام آسانی سے سمجھے جا سکتے ہیں۔

جدول 1: طلاق کی مختلف صورتوں میں مہر کے احکام (احناف کے مطابق)

صورت	مہر مسمّیٰ مقرر تھا	مہر مقرر نہیں تھا
خلوتِ صحیحہ / صحبت سے پہلے طلاق	آدھا مہرِ مسمّیٰ واجب	مہر نہیں، صرف متعہ (جوڑا وغیرہ) واجب

پورا مہرِ المثل واجب	پورا مہرِ مسمّیٰ واجب	خلوتِ صحیحہ کے بعد طلاق
پورا مہرِ المثل واجب	پورا مہرِ مسمّیٰ واجب	شوہر کی وفات (کسی بھی مرحلے پر)
طے شدہ عوض کے مطابق فیصلہ	طے شدہ عوض کے مطابق فیصلہ	عورت کی طرف سے جدائی کی بعض صورتیں (مثلاً خلع)

خلوتِ صحیحہ سے پہلے طلاق کے احکام

اگر شوہر بیوی کو صحبت اور خلوتِ صحیحہ سے پہلے طلاق دے دے تو اس کے دو حکم ہیں۔ پہلی صورت یہ ہے کہ مہر عقد میں مقرر کیا گیا تھا، یعنی مہرِ مسمّیٰ موجود تھا؛ اس صورت میں عورت کو اس مقررہ مہر کا آدھا ملے گا۔ اس کی دلیل قرآن مجید کی صریح آیت ہے کہ اگر تم انہیں ہاتھ لگانے سے پہلے طلاق دو اور ان کے لیے مہر مقرر کر چکے ہو تو مقررہ مہر کا آدھا دینا ہو گا، الا یہ کہ عورتیں معاف کر دیں یا وہ شخص معاف کر دے جس کے ہاتھ میں عقدِ نکاح ہے (البقرہ: 237 کے مفہوم کے مطابق)۔ اس نصف کی حکمت یہ ہے کہ جدائی شوہر کی طرف سے ہوئی ہے اور عقد کے مالی اثرات کا کچھ بوجھ اسی پر آئے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ مہر سرے سے مقرر ہی نہیں ہوا تھا؛ اس صورت میں عورت کو مہر کے نام پر کچھ نہیں ملے گا، کیونکہ نہ مسمّیٰ ہے جس کا نصف دیا جائے اور نہ صحبت ہوئی ہے جس سے مہرِ مثل ثابت ہو، البتہ اسے متعہ دینا واجب ہو گا، یعنی شوہر اپنی حیثیت کے مطابق اسے ایک جوڑا کپڑے وغیرہ دے کر رخصت کرے، جیسا کہ قرآن مجید نے اسی صورت کے لیے متعہ کا حکم دیا ہے (البقرہ: 236 کے مفہوم کے مطابق)۔ متعہ کی مقدار کا تعین شوہر کی مالی حیثیت دیکھ کر کیا جاتا ہے اور اسے اس خاص صورت میں فقہاء نے واجب قرار دیا ہے، عام صورتوں میں یہ مستحب ہے۔

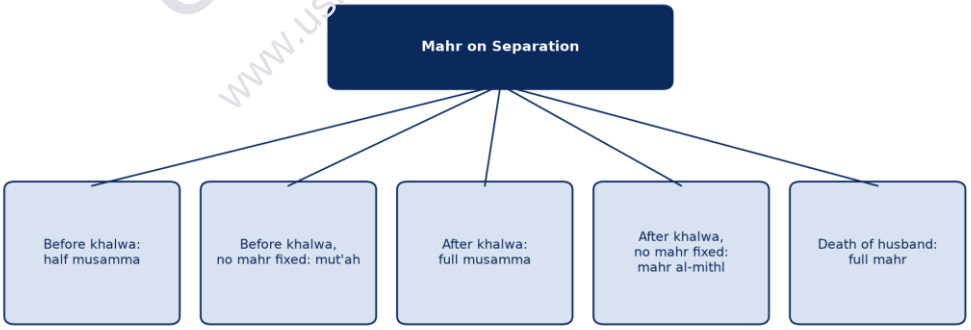
خلوتِ صحیحہ کے بعد طلاق اور وفات کے احکام

اگر طلاق خلوتِ صحیحہ کے بعد واقع ہو تو حکم بدل جاتا ہے۔ الہدایہ کے مطابق خلوتِ صحیحہ مہر کو مکمل طور پر ثابت کر دیتی ہے، اس لیے اس کے بعد طلاق کی صورت میں عورت پورے مہر کی حقدار ہو گی؛ اگر مہر مقرر تھا تو پورا مہرِ مسمّیٰ اور اگر مقرر نہیں تھا تو پورا مہرِ المثل۔ فقہاء نے خلوتِ صحیحہ کو صحبت کے قائم مقام رکھنے کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ جب

فریقین بلامانع تنہائی میں رہے تو شریعت نتیجے کے اعتبار سے اسے دخول ہی کے حکم میں رکھتی ہے، تاکہ عورت کے حق میں کوئی کمی نہ ہو اور شوہر تاخیر یا حیلے سے اس کے حق کو ختم نہ کر سکے۔ اسی بنا پر خلوتِ صحیحہ کے بعد طلاق کی صورت میں عورت پر عدت بھی لازم آتی ہے، جبکہ خلوت سے پہلے طلاق میں عدت نہیں ہوتی، جیسا کہ قرآن مجید نے واضح فرمایا ہے (الاحزاب: 49 کے مفہوم کے مطابق)۔ تیسری اہم صورت وفات ہے: اگر شوہر کا انتقال ہو جائے، خواہ صحبت ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو، اور خواہ نکاح کے بعد فوری ہو، تو عورت کو پورا مہر ملے گا، مقرر تھا تو پورا مسمّیٰ اور نہیں تھا تو پورا مہرِ المثل، کیونکہ وفات سے عقد اپنے تمام اثرات سمیت مکمل ہو جاتا ہے اور اسی لیے بیوہ کو شوہر کی میراث بھی ملتی ہے اور اس پر وفات کی عدت بھی ہوتی ہے۔ البتہ اگر جدائی عورت کی طرف سے کسی ایسی وجہ سے ہو جو اس سے صادر ہو، مثلاً اس کا مرتد ہو جانا یا خیارِ بلوغ سے نکاح ختم کرانا بشرائط، تو مہر کے احکام مختلف ہو سکتے ہیں اور ہر صورت کا حکم اس کی تفصیل کے مطابق ہو گا، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جس فریق کی طرف سے عقد صحبت سے پہلے ختم ہو، مالی نتیجہ اسی کے خلاف زیادہ جاتا ہے۔

USMAN NOTES www.usmannotes.com

Figure 2: Mahr outcomes by stage of separation



شکل 1: جدائی کی صورت اور مرحلے کے مطابق مہر کے تعین کا خاکہ

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ الہدایہ کی روشنی میں مہر نکاح کا واجب مالی اثر ہے، خواہ عقد میں اس کا ذکر ہو یا نہ ہو؛ اس کی کم از کم مقدار احناف کے نزدیک دس درہم ہے اور زیادہ کی کوئی حد نہیں۔ خلوتِ صحیحہ سے پہلے طلاق میں مقررہ مہر کا نصف، اور مہر مقرر نہ ہونے کی صورت میں صرف متعہ واجب ہوتا ہے؛ خلوتِ صحیحہ کے بعد طلاق یا شوہر کی وفات کی صورت

میں مہر پورا دیا جائے گا، مقرر ہونے پر مہر مسمّیٰ اور غیر مقرر ہونے پر مہر المثل۔ یہ منظم ضابطہ عورت کے مالی حق کو ہر مرحلے پر محفوظ رکھتا ہے اور فقہ اسلامی کے عائلی نظام کی حکمت کو ظاہر کرتا ہے۔

USMAN NOTES
www.usmannotes.com